

عطاء الحق قاسمی کی اردو نثر کا اسلوبیاتی مطالعہ (پنجابی لفظیات کے تناظر میں)

The Stylic Study Of Atta Ul Haq Qasmi's Prose
(In the content of Punjabi Wordings)

جاوید اقبال، پی ایچ ڈی اردو اسکالر، شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد
Javed Iqbal, PhD Scholar, Dept. of Urdu, NUML, Islamabad

ڈاکٹر رخشندہ مراد، استاذ شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد
Dr. Rukhshanda Murad, Assistant Professor, Dept. of Urdu,
NUML, Islamabad.

Abstract

The tradition of humorous prose writing in Urdu is quite long. From the beginning to the modern era, humorous prose writing has been experimented with intellectually as well as artistically and stylistically. Ata-ul-Haq Qasmi is also one of the prose writers who rose to prominence in terms of prose and style. He used Punjabi words in Urdu prose along with other experiences in an excellent way. The use of Punjabi words has reflected Punjabi culture and civilization in his Urdu prose as well as stylistic refinement. Through this article and attempt has been made to study the Style of his prose in content of Punjabi wordings.

Key Words: Prose, Style, Punjabi Wordings, Culture, Civilization

کلیدی الفاظ: نثر، اسلوب، پنجابی لفظیات، کلچر، تہذیب

اسلوب تحریر کے انداز کو کہا جاتا ہے۔ انگریزی میں اس کے لیے Style کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے مراد وہ انداز ہوتا ہے جو کوئی لکھاری اپنے تخیلات، مشاہدات اور جذبات کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اسلوب کسی بھی لکھاری کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور اس کی تحریر کا اسلوب ہی اصل میں بطور مصنف اس کی پہچان کرواتا ہے۔ بہت سے اعلیٰ پائے کے ادیب ایسے ملتے ہیں جن کے اسلوب بیان کی چاشنی نے ان کی تحریروں میں جان ڈال دی اور ان کو ایک نیا آہنگ عطا کر دیا۔

اسلوب بیان کے لیے ضروری ہے کہ مصنف کا اسلوب اس کے اس عہد کی عکاسی کرے جس عہد کا وہ ادب تخلیق کر رہا ہے۔ اس عہد کی لسانی صورت حال، اس عہد کی سماجی اور ثقافتی صورت حال اور اس عہد کے رویوں کی عکاسی اس کے اسلوب سے ہونی چاہیے تبھی اس کا اسلوب جاندار بن پائے گا اور اس کی تحریر میں جان ڈال دے گا۔ عہد کے ساتھ ساتھ مصنف کا اسلوب بیان اس طبقے سے بھی مطابقت رکھتا ہو جس طبقے کے لوگوں کو وہ اپنی تحریر میں استعمال کر رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے لکھاری مختلف انداز اپناتا ہے۔ وہ مختلف تکنیکیں استعمال کرتا ہے جو اس کے اسلوب کو جاندار بنا کر اس کے تصورات اور خیالات کو احسن طریقے سے قارئین کے سامنے پیش کر سکیں۔

اصناف ادب کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہر صنف کے اسلوب کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں جن کو پورا کرنا ادیب یا شاعر کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ کسی بھی صنف کے بنیادی فنی خصائص کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں صورت حال کچھ اس طرح سے سامنے آتی ہے کہ ادیب کو اسلوب کے حوالے سے افقی اور عمودی دونوں تناظرات میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ افقی تناظر میں سفر کرتے ہوئے وہ بہت سی اصناف میں سے کسی ایک یا ایک سے زیادہ اصناف کا انتخاب کرتا ہے اور اس کا اسلوب اپناتے ہوئے اپنے خیالات اور تاثرات کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرتا ہے۔ اس عمل کے دوران اسے اس صنف کے باقی ادیبوں سے خود کو ممتاز کرنے کے لیے عمودی سفر کرتے ہوئے اپنا ایک الگ اسلوب اختیار کرنا پڑتا ہے تب جا کر اس کی تحریر اس کی پہچان بن کر ابھرتی ہے اور اس مقام پر پہنچنے کے بعد اس کا اسلوب بیان لاکھوں ادیبوں کی تحریروں میں اس کی پہچان بن کر سامنے آتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی ایک کہنہ مشق مزاح نگار ہیں۔ ان کی تحریریں لطافت اور نزاکت کے عناصر لیے ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کا اسلوب بیان خاصا لطیف ہے۔ وہ معاشرے کی ناہمواریوں کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں اور اس بارے میں اپنے مشاہدات کو بڑے لطیف انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں موجود پنجابی زبان کے الفاظ کے حوالے سے بات کی جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انہوں نے پنجابی زبان کے الفاظ کو نہ صرف خاص معاشرتی اور ثقافتی تناظر میں بیان کیا ہے بلکہ فنی حوالے سے ان الفاظ کے استعمال میں خاص مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی تحریروں میں موجود پنجابی الفاظ نہ تو تحریر کو بوجھل بناتے ہیں اور نہ ہی تحریر کی روانی میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔

مزاح نگاری میں ایک اہم حربہ صورت واقعہ سے مزاح پیدا کرنے کا ہوتا ہے۔ تخلیق کار کسی ایسی صورت حال کو بیان کر رہا ہوتا ہے جو عام شاہد کے لیے غیر معمولی نہیں ہوتی

لیکن تخلیق کار کا اسلوب بیان اس معمولی صورت حال کو بھی غیر معمولی بنا کر پیش کر دیتا ہے اور اس کا انداز ایسا لطیف ہوتا ہے کہ قاری ایک لمحے کے لیے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے خاصی گہری سوچ میں اتر جاتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کو صورت واقعہ سے مزاح پیدا کرنے میں خاص مہارت حاصل ہے اور اس امر کے لیے وہ پنجابی الفاظ کا استعمال بھی بڑی خوبصورتی سے کرتے ہیں۔

”میر اسیر کا تجربہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔ بس یوں سمجھیں کہ رنگروٹ بھرتی ہوا ہوں چنانچہ جب کوئی صاحب پارک میں اچانک نظر پڑتے ہیں اور اس عالم میں کہ ان کی ٹانگیں اوپر اور سر نیچے ہے اور وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہے ہیں تو میں دبک سا جاتا ہوں..... گزشتہ روز میں نے ایک بزرگ کو رسی ٹاپتے دیکھا بلکہ غور سے دیکھا تو ان کے چہرے پر حیا کی سرخی بھی تھی، میں ”غص بھر“ سے کام لیا اور ان کے قریب سے نظریں چرا کر اس طرح گزرتا گیا جیسے نامحرموں کو گزرنا چاہیے۔“

(۱)

قاسمی نے یہاں صورت واقعہ سے جو مزاح پیدا کیا ہے وہ قاری کو ایک لمحے کے لیے اپنے سحر میں لے لیتا ہے اس کے ساتھ ساتھ رسی ٹاپنے کے الفاظ استعمال کر کے انہوں نے اسلوب میں خاصی چاشنی اور روانی پیدا کی ہے۔

صورت واقعہ سے مزاح پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ مزاح پیدا کرنے کا ایک اور اہم حربہ الفاظ کے ہیر پھیر کا بھی ہے۔ قاسمی صاحب کا اعجاز یہ ہے کہ پنجابی زبان کے الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے وہ لفظوں کے ہیر پھیر سے اس انداز میں مزاح پیدا کرتے ہیں کہ ان الفاظ کا ایک نیا مفہوم سامنے آنے لگتا ہے اور یہ وہ مفہوم ہوتا ہے جو پہلے مفہوم سے ذرا بھی میل نہیں کھاتا یوں الفاظ کے تھوڑے سے ہیر پھیر سے وہ معنوی سطح پر بہت بڑا کام لے لیتے ہیں۔ ذیل کے اقتباس میں دیکھیے کہ کس طرح الفاظ کی صرف ترتیب بدلنے سے انہوں نے جملے میں خاصا مزاح پیدا کر لیا ہے۔

”معاملہ یہیں تک محدود ہو تو بھی خیر ہے، صبح صبح ایک دو نہیں، بیسیوں توندیں بیک وقت دیکھنا پڑتی ہیں جنہیں ڈاکٹروں نے سیر پر لگا رکھا ہے اور خود ڈاکٹر ان سے مشورہ فیس بٹورنے پر لگے ہوئے ہیں، صبح کو سیر کو نکلیں تو لگتا ہے ہسپتال کا راونڈ لگا رہے ہیں، نہار منہ شوگر کے مریض، اور بڑی بڑی ”گوگڑوں“ والے تاجروں سے مڈ بھیڑ ہوتی ہے، گنجے ان

کے علاوہ ہیں جن کا خیال ہے کہ سیر سے سر پر بال اگ سکتے ہیں! ان سب کے خیال میں وہ ”سیر سور“ کر رہے ہوتے ہیں حالانکہ ان میں سے کچھ کے بارے میں تو ”سیر سور“ والی ترکیب کو الٹا کر دیا جائے تو مطالب زیادہ بہتر طور پر واضح ہوتے ہیں۔“ (۲)

اس اقتباس میں دیکھا جاسکتا ہے کہ اس طرح انہوں نے محض ایک ترکیب کے دو الفاظ کی ترکیب کو الٹا کرنے سے مزاح پیدا کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں جو منظر نامہ بیان کیا گیا ہے وہ بذات خود خاصی لطیف صورت حال کی عکاسی کر رہا ہے۔ اس سے عطاء الحق قاسمی کے اسلوب بیان کی شگفتگی نمایاں ہوتی ہے کہ وہ کس طرح ایک منظر سے لطیف اور شگفتہ انداز میں الفاظ کے استعمال سے مزاح پیدا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔

لفظوں کے موزوں استعمال سے مزاح پیدا کرنے میں قاسمی کو جو ملکہ حاصل ہے اس میں وہ سماجی اور ثقافتی تناظر خاص کردار ادا کرتے ہیں جو اس معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں۔ ان سماجی اور ثقافتی تناظرات نے ان کے اسلوب بیان میں خاصا نکھار پیدا کیا ہے۔ وہ ہر عمر کے لوگوں کی عادات و خصائل سے بخوبی آگاہی رکھتے ہیں اور ان کے بارے میں بیان کرتے وقت اسلوب بیان ایسا اختیار کرتے ہیں کہ اس عمر اور طبقے کے لوگوں کی بخوبی عکاسی ہونے لگتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ پنجابی لفظیات کا استعمال کر کے تحریر کی معنویت میں مزید تاثیر پیدا کر لیتے ہیں۔ ایک سیر کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”بزرگوں کے سیر کرنے کا اپنا انداز ہے وہ سیر میں بھی عاقبت کو یاد رکھتے ہیں چنانچہ چند قدم چلنے کے بعد وہ کسی درخت کے سائے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک کھڑا ہو کر نعت پڑھنے لگتا ہے اور دوسرے جھومنے لگتے ہیں، بعض ”ثقافتی“ قسم کے بزرگ ہیر گانے لگتے ہیں، میں نے بعض ”کن کٹے“ بزرگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنی اور دوسرے کی عمر کا خیال کیے بغیر ایک دوسرے کو ”لانگڑیاں“ بھی دیتے ہیں اور پھر اگلے دو چار روز گراؤنڈ میں نظر نہیں آتے، غالباً ”گراؤنڈ“ ہو جاتے ہیں۔“ (۳)

اس اقتباس کا فنی حوالے سے جائزہ لیا جائے تو اس میں عطاء الحق قاسمی نے کئی حوالوں سے پنجابی الفاظ کو بڑی مہارت سے استعمال کر کے تحریر کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ ”کن کٹے“ اور ”لانگڑیاں“ ایسے الفاظ ہیں جن کے استعمال سے ان کے اسلوب میں جو تاثیر پیدا ہوئی ہے وہ شاید ان کے اردو متبادلات کے استعمال سے نہ ہو پاتی۔ عطاء الحق قاسمی کو الفاظ کے

درست چناؤ اور ان کے درست استعمال پر گرفت ہے۔ وہ تحریر میں ایسے غیر ضروری الفاظ استعمال نہیں کرتے جن سے تحریر میں بوجھل پن محسوس ہو اور روانی میں رکاوٹ بنے۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف الفاظ کے مختلف زبانوں میں استعمال کے بارے میں خاصی آگاہی رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو یہاں گراؤنڈ کا لفظ خاص معنویت رکھتا ہے۔ پہلے معنوں میں گراؤنڈ اس میدان کے لیے استعمال کیا گیا ہے جس میں صبح کے وقت لوگ سیر کے لیے جاتے ہیں اور اس پیراگراف کے آخر میں گراؤنڈ کا لفظ روپوش ہو جانے اور چھپ جانے یا زیر زمین چلے جانے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ گراؤنڈ انگریزی کا لفظ ہے اور انگریزی میں بھی ان دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن عطاء الحق قاسمی نے یہاں گراؤنڈ کا لفظ جس طرح استعمال کیا ہے اس سے اسلوب میں ایک نیارنگ پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ اس لفظ کی ذومعنویت بھی نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے۔

لفظوں سے مزاح پیدا کرنے اور اسلوب میں لطافت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ عطاء الحق قاسمی بعض اوقات تحریر میں شاعرانہ انداز بھی اختیار کرتے ہیں۔ وہ نثر لکھتے وقت اس میں شعروں یا مصرعوں کا استعمال اس طرح کرتے ہیں کہ ان کی نثر شاعری کا لطف دینے لگتی ہے۔ شعروں اور مصرعوں کے بر محل استعمال میں ان کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ وہ کسی بھی شعر یا مصرعے کو اس انداز میں استعمال نہیں کرتے کہ ان کی نثر میں وہ ٹھونسا ہوا محسوس ہو بلکہ ان کی نثر میں شعر اور مصرعے اس طرح ضم ہو جاتے ہیں کہ وہ نثر ہی کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ ذیل میں دیکھیے کہ کس طرح وہ شعروں کے استعمال سے اپنی نثر کو مزین کرتے ہیں۔

”نقوی صاحب نے پیار سے اس کی کمر کو سہلایا اور پھر مجھے

مخاطب کر کے کہنے لگے ”عطا بھائی آپ کیوں پرے کھڑے

ہیں، ذرا قریب آئیں“ حالانکہ مشہور شعر ہے:

حسینوں سے فقط صاحب سلامت دور کی اچھی

نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی

مگر غالباً نقوی صاحب نے یہ شعر نہیں سنا ہوا تھا!“^(۴)

اسی طرح بعض اوقات وہ مکمل شعر کی بجائے شعر کے ایک مصرعے سے بھی بخوبی کام لے لیتے ہیں۔ ایک مصرعے کا استعمال کر کے نثر کو لطیف بنانے کی روایت کئی نثر نگاروں کے ہاں ملتی ہے۔ بہت سے نثر نگار مصرعے کو اس انداز میں استعمال کرتے ہیں کہ نثر میں لطافت آنے کی بجائے قاری یہ سوچنے لگتا ہے کہ تخلیق کار کہنا کیا چاہتا ہے اور اس کا مافی الضمیر کیا ہے۔ البلاغ کے یہ مسائل نثر کو بے جان بنا دیتے ہیں۔ نثر میں مصرعے کا استعمال کرتے

وقت بہت سی باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ جس مصرعے کا استعمال کیا جا رہا ہو وہ عام فہم اور مقبول عام مصرعہ ہو۔ غیر مقبول مصرعے استعمال کرنے سے نثر میں بوجھل پن پیدا ہو جاتا ہے جو قاری کی طبیعت پر خاصا گراں گزرتا ہے۔ اس کے علاوہ جو مصرعہ استعمال کیا جا رہا ہو وہ نثری تحریر سے کسی نہ کسی حوالے سے مطابقت بھی رکھتا ہو تاکہ قاری اس سے حظ اٹھا سکے کیونکہ نثری تحریر خاص طور پر مزاح میں حظ کی بنیادی اہمیت ہوتی ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو عطاء الحق قاسمی کی نثر میں مصرعوں کا استعمال خاصا بر محل ملتا ہے جس سے ان کے اسلوب میں شگفتگی پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی تحریر میں بھی خاصی روانی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک جگہ مصرعہ کا استعمال یوں خوب صورتی سے کرتے ہیں۔

”شیرنی نے اپنی آنکھیں میرا مطلب ہے اپنے ڈیلے اوپر کیے جن میں
شکایت ہی شکایت تھی مگر پھر وہ اٹھ کر پنجرے کے قریب آگئی
اور نقوی صاحب سے گلے ملنے کی کوشش کی تاکہ
جب گلے سے مل گئے سارا گلہ جاتا رہا
کے مصداق تجدید محبت کا اعلان کیا جاسکے لیکن ظالم سماج یعنی سلاخوں
کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔“ (۵)

شعروں اور مصرعوں کا استعمال کرتے ہوئے بعض اوقات وہ شاعر کا حوالہ بھی دیتے چلے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک اچھا ادیب جب کسی کا قول یا بات کسی موقعہ کے لیے استعمال کرتا ہے تو وہ ان دونوں موقعوں اور حالات میں کوئی نہ کوئی مشترک وصف تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے مشاہدات کو کسی دوسرے شاعر یا ادیب کی نظر سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ یہ وصف اس لکھاری میں پیدا ہو سکتا ہے جس کا مطالعہ وسیع ہو اور وہ اپنے مطالعہ اور مشاہدہ کے درمیان تعلق قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ عطاء الحق قاسمی اپنے ایک مضمون میں شعر کا استعمال یوں کرتے ہیں:

”ڈاکٹر نے مجھے سیڑھیاں چڑھنے اور اترنے کے ضمن میں بہت احتیاط کا
مشورہ دیا، ان کا کہنا تھا کہ اس عمل کے دوران زیادہ پھرتیاں دکھانا
نقصان دہ ہے چنانچہ آپ سیڑھیاں اس احتیاط سے چڑھیں اور اتریں
جس احتیاط کی تلقین میر تقی میر نے کی ہے.....

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگاہ شیشہ گری کا“ (۶)

یوں دیکھا جائے تو مجموعی طور پر عطاء الحق قاسمی کا اسلوب خاصا لطیف اور شگفتہ ہے۔ ان کی نثر رواں ہے۔ شعروں اور مصرعوں کے بر محل استعمال سے انھوں نے اپنی نثر کو مزید نکھارا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی نثر کے اسلوب کی جواہر خوبی قارئین کو متاثر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ لفظی کفایت شعاری کے اصول پر سختی سے کار بند نظر آتے ہیں۔ لفظوں کے چناؤ اور پھر ان کے بہترین اور بر محل استعمال پر انھیں خاص ملکہ حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین اور کالموں کی نثر بوجھل محسوس نہیں ہوتی۔ ان کا اسلوب ان کی نثر کو خاصا جاندار بناتا ہے۔ وہ چھوٹے جملوں اور مختصر الفاظ میں بہت بڑے مطالب بیان کرنے پر خاصی قدرت رکھتے ہیں۔ اسلوب میں پنجابی زبان کے الفاظ کو وہ اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ وہ لفظ ٹھونسے ہوئے محسوس نہیں ہوتے بلکہ پورا ایک سماجی اور ثقافتی منظر نامہ بیان کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ یوں ان کے اسلوب میں پنجابی زبان کے الفاظ کا استعمال ان کے اسلوب میں دلکشی اور رعنائی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ پنجابی معاشرت کی بھی بخوبی عکاسی کرتا ہے۔ مجموعی طور پر ان کا اسلوب ان کے مافی الضمیر کا ترجمان بننے کے ساتھ ساتھ قاری کو حظ پہنچانے کا بھی ذریعہ بنتا ہے۔

بیانیہ کسی بھی تحریر کو جاندار بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ تخلیق کار کے مشاہدات، احساسات اور تجربات اس کے ذہن میں ایک وسیع کائنات کی صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ اس وسیع کائنات کو اپنے قارئین تک پہنچانے کے لیے تخلیق کار کے پاس متنوع انداز ہوتے ہیں۔ اس کی تحریر سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ کس انداز میں اپنا مافی الضمیر قارئین تک پہنچا رہا ہے۔ ایک طرف وہ اپنے اسلوب کو رواں رکھنے کے لیے موزوں الفاظ کا سہارا لیتا ہے تو دوسری طرف ان الفاظ کے استعمال میں مختلف اور متنوع انداز اختیار کر کے اپنے بیانیہ کی تکمیل کرتا ہے۔

لطیف نثری تحریروں میں ادیب کو اپنا بیانیہ خاصی محنت سے تشکیل دینا پڑتا ہے۔ الفاظ کے چناؤ اور پھر ان الفاظ کے استعمال میں خاص مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تخلیق کار اپنے بیانیہ کی تشکیل کے لیے مختلف تکنیکوں کا سہارا بھی لیتا ہے۔ اس کے علاوہ بات کرنے کے مختلف انداز بھی اپنائے جاتے ہیں یہ سب چیزیں مل کر کسی مصنف کا بیانیہ تشکیل دیتی ہیں۔ عطاء الحق کے قاسمی کی تحریروں کے مطالعہ سے ان کے بیانیہ کا سراغ لگایا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کے بیانیہ میں بات کرنے کے متنوع انداز پائے جاتے ہیں۔ وہ موقع محل اور موزونیت کو مد نظر رکھتے ہوئے بات کرنے کا انداز اپناتے ہیں۔ ان کا بیانیہ ان

کے مافی الضمیر کی اچھی ترجمانی کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ قاری ان کی تحریروں کے سحر میں کھو کر رہ جاتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی تخلیق میں بعض اوقات مکالماتی انداز اختیار کرتے ہیں۔ مکالماتی انداز جہاں تحریر کو دلچسپ بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے وہیں یہ بات بھی ایک حقیقت ہے کہ مکالماتی انداز کے تقاضے پورے کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں مکالمہ کسی بھی تحریر کی جان ہوتا ہے اور یہ اس وقت ہی تحریر کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے جب اس میں حصہ لینے والے کرداروں کو تخلیق کار بات کرتے ہوئے سنبھالے رکھنے پر قدرت رکھتا ہو۔ مکالمے میں مناسب الفاظ کے استعمال کے ساتھ ساتھ متکلم کے لہجے اور انداز تکلم کی بھی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ اگر متکلم اپنے عہد کی زبان سے ذرا سی بھی روگردانی اختیار کرے تو مکالمہ تحریر کا حسن بننے کی بجائے اس کا عیب بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تخلیق کار کو اس بات کا بھی خاص خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اس کے کردار درست سمت میں آگے بڑھ رہے ہوں اور مکالمے میں ارتقائی عمل جاری رہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں استعمال ہونے والا مکالماتی انداز ان اصولوں کی کافی حد تک پاسداری کرتا ہے۔ اپنے ایک مضمون ”رحم دل لوگ“ میں وہ بیانیہ کا یہ انداز اپناتے ہیں۔

”یار رمضان کی وجہ سے برا حال ہے کچھ انتظام ہوا؟“

”کوشش کر رہا ہوں کہ کسی سے رابطہ ہو جائے“

”یار سختی بہت ہے ورنہ حال میرا بھی وہی ہے جو تمہارا ہے“

”اگر تمہارا حال برا ہوتا تو اب تک تم نے مل بیٹھنے کا کوئی انتظام کر لیا

ہوتا۔“

”تو تم کیا سمجھتے ہو میں جان بوجھ کر انتظام نہیں کر رہا“ (۷)

اس مکالمے کو دیکھا جائے تو قاسمی کے ہاں لوگوں کے ذہنی رجحانات کا بھی خوب علم ہوتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے پر ایک تو اعتماد کرنے سے احتراز کرتے ہیں اور اگر کسی پر اعتماد کر کے اپنی مجبوری بیان کر بھی دیں تو پھر بھی ان کو یہ شک گھیرے رکھتا ہے کہ شاید دوسرے لوگ جان بوجھ کر اس کی مجبوری سے لذت حاصل کرنے میں لگے ہیں اور کسی کو اس کا احساس نہیں۔ قاسمی مکالموں کے لیے الفاظ کا ایسا چناؤ کرتے ہیں کہ وہ الفاظ بولنے والے کی ذہنی کیفیت کو بھی بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایک اور جگہ مکالماتی انداز کا حسن ملاحظہ ہو:

”جو زف نے پوچھا“ صاحب آپ باہر سے آئے ہو؟“

”ہاں بھی کل ہی لوٹا ہوں“

”میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ روم جانے کا ارادہ ہے“

”تو پھر کیسا لگا روم؟“

”بھئی جوزف کیا کہنے اس شہر کے، میں نے دنیا گھومی ہے

لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس شہر کا کوئی

جواب نہیں^(۸)

قاسمی کے کردار مکالماتی عمل میں ایک دوسرے سے یوں کلام کرتے ہیں جو اس صورت حال سے میل کھاتا ہو۔ لوگوں کی آپس میں باہمی رفاقت اور رقابت ان کے کرداروں کے مکالمات سے نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے، اس کے علاوہ ان کے کرداروں کی مکالماتی زبان اپنے عہد اور لسانی مزاج سے خاص ہم آہنگی کا ثبوت دیتی ہے یہ وجہ ہے کہ ان کے مکالمے تحریر کی تاثیر میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

مکالمے کا اصل حسن یہ ہوتا ہے کہ اس کے کردار اپنی سماجی سطح اور ثقافتی صورت حال کے مطابق گفتگو کریں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک کردار سماج میں کسان کا کام کرتا ہے اور مکالمہ کے دوران میں اس کا لہجہ اور الفاظ بیوروکریٹ جیسا ہو، کسی کردار کو اپنے طبقے کی زبان سے اوپر والے طبقے کی زبان میں بات کرتے دکھانا تخلیق کار کی مہارت نہیں بلکہ کمزوری ہے جو اس کی تخلیق پر مکمل گرفت نہ ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو قاسمی کے کردار اپنے سماجی مرتبے کو سامنے رکھتے ہوئے گفتگو کرتے ہیں۔ ایسا ہی ایک خوبصورت مکالمہ ان کے ایک مضمون ”صبح کرنا شام کا.....“ میں بیان ہوا ہے۔ اس مکالمے میں جو کردار حصہ لے رہے ہیں ان میں ایک ریٹائرڈ بزرگ ہیں جو محض وقت گزاری کے لیے کسی دوکان کے سامنے مونڈھے پر بیٹھے اور باتیں کرتے رہتے ہیں جب کہ دوسرا کردار ایک راہ گیر جو ان سے کسی منزل کا راستہ پوچھتا ہے۔ ان کے مابین ہونے والی گفتگو کو قاسمی نے یوں بیان کیا ہے:

”آپ کہاں سے آرہے ہیں؟“

”جی گو جرنوالہ سے آرہا ہوں“

”وہاں کس محلے میں رہتے ہیں؟“

”سیٹلائٹ ٹاؤن میں رہتا ہوں“

”شیخ اکرم صاحب کو تو آپ جانتے ہوں گے؟“

”نہیں جی“

”کمال ہے! کتنے عرصے سے آپ وہاں رہ رہے ہیں؟“

”تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے۔“

”تجھی..... لاہور تک ٹرین میں آئے ہیں یا بس میں“

”جی بس میں آیا ہوں“

”پرائیویٹ بس میں آئے ہیں یا جی ٹی ایس میں؟“

”پرائیویٹ بس میں آیا ہوں۔“

..... شادی وادی تو ہو گئی ہوگی۔.....“ (۹)

اس مکالمے کے کردار اپنی سماجی اقدار کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ ایک طرف مجبور راہ گیر ہے جس کے لہجے سے کرب اور جلدی جانے کا تاثر ظاہر ہو رہا ہے تو دوسری طرف ریٹائرڈ شخص ہے جس کا کام محض وقت گزاری ہے۔ یہی مکالمے کا حسن ہے کہ اس کے کرداروں کے منہ سے ادا ہونے والے الفاظ ان کی سماجی حیثیت کو بھی سامنے لائیں۔ یہ خوبی عطاء الحق قاسمی کے بیانیے کو خاصا مضبوط بناتی ہیں اور قاری ان کی تحریر سے لطف لینے لگتا ہے۔

مؤثر بیانیے میں تخلیق کار مختلف الفاظ کی ذو معنویت کو بھی بڑی مہارت سے کام میں لاتا ہے۔ وہ الفاظ کی ذو معنویت سے اپنی تحریر کو چار چاند لگا دیتا ہے اور وہی تحریر اس کے بیانیہ کی اہم کڑی بن جاتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی لفظوں کی ذو معنویت سے خوب کام لیتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

”پاکستان میں پیروں فقیروں کی بہت پذیرائی ہوتی ہے۔ میں ایک پیر صاحب کے ڈیرے پر گیا۔ پیر صاحب بہت بڑے جاگیر دار ہیں۔ ڈیرے پر ان کے مریدوں کا جگمگٹا تھا جو والہانہ طور پر ان کا ہاتھ چوم رہا تھا۔ پیر صاحب اس دوران مجھ سے آکسن لہجے کی خوب صورت انگریزی میں گفتگو کرتے رہے اور اپنا بایاں ہاتھ انہوں نے بے نیازی سے مریدوں کے بوسے کے لیے ان کی طرف پھیلائے رکھا۔ جب مرید اس اظہار عقیدت سے فارغ ہوئے تو پیر صاحب نے نشو و پیر سے ہاتھ کے اس حصے کو اچھی طرح رگڑ رگڑ کر صاف کیا جہاں ان کے مرید طبع آزمائی کرتے رہے تھے واضح رہے کہ یہ پیر صاحب اپنے مریدوں سے باہر کے حلقے میں بھی ہاتھ کی صفائی کے لیے مشہور ہیں۔“ (۱۰)

”ہاتھ کی صفائی“ کی ذو معنویت سے عطاء الحق قاسمی نے یہاں بہت کام لیا ہے۔ ہاتھ کی صفائی انتہائی چالاکی، ہشیاری اور دوسروں کو نظروں کے سامنے دھوکا دینے کے مترادف

سمجھی جاتی ہے۔ یہاں انھوں نے اس کو ہاتھ صاف کرنے اور پھر آگے چل کر دوسروں کو اپنے دام میں اتارنے کے معنوں میں استعمال کر کے اس سے خوب کام لیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاسمی صاحب کو اپنے بیانیے پر عبور حاصل ہے۔ وہ مختلف الفاظ اور تراکیب کو مختلف معنوں میں استعمال کرنے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں بھی پنجابی لفظیات کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ انھوں نے ان لفظیات کو اس طرح اردو میں سمویا ہے کہ وہ اردو ہی کا حصہ معلوم ہوتے ہیں اور دوران قرات، قاری پر گراں نہیں گزرتے۔ عطاء الحق قاسمی نے پنجابی زبان کی لفظیات استعمال کرنے کے متنوع طریقے استعمال کیے ہیں۔ کہیں تو وہ ان کا استعمال بالکل اصلی صورت میں کرتے ہیں اور کہیں وہ ان میں اشکالی حوالے سے رد و بدل کر کے تحریر میں اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ وہ لفظ پنجابی کے ہی معلوم ہونے کے باوجود قاری کے لیے ایک نئے حظ کا باعث بنتا ہے اور قاری ان کی تحریر کے سحر میں کھو کر رہ جاتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی پنجابی زبان کی لفظیات کا استعمال کرتے وقت سماجی صورت حال کو بھی سامنے رکھتے ہیں۔ بسوں اور دیگر ذرائع نقل و حمل میں سفر آج کے انسان کی بنیادی ضرورت بن گئی ہے۔ وہ زمانے گزر گئے جب لوگ پیدل میلوں کے سفر کیا کرتے تھے لیکن اب قلیل مسافرت کے لیے ذاتی یا کرائے کے ذرائع نقل و حمل استعمال کیے جاتے ہیں۔ کرائے کے ذرائع نقل و حمل میں مسافر کو بہت سی صعوبتیں بھی اٹھانا پڑتی ہیں۔ خاص طور پر کم ذرائع اور زیادہ مسافر ہونے کی صورت میں سیٹ حاصل کرنے کا عمل خاصا دشوار ہوتا ہے اور اگر سیٹ مل بھی جائے تو ہر شخص خود کو ہی آرام دینے کی کوشش میں لگا نظر آتا ہے۔ اس دوران بعض اوقات بات تو ٹکار تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی کا اس بارے میں مشاہدہ خاصا وسیع ہے وہ نہ صرف ان تمام حالات کو بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ ان کا بیانیے میں پنجابی الفاظ اس طرح استعمال ہوتے ہیں کہ کسی مخصوص پنجابی لہجے کی بھی عکاسی ہونے لگتی ہے۔ ایسے ہی ایک سفر کا حال بیان کرتے ہوئے وہ پنجابی لفظیات کا استعمال اپنی کتاب ”عطائے“ میں یوں کرتے ہیں:

”میں نے دائیں جانب سرکنے کی کوشش کی، مگر سیٹ اس قدر تنگ تھی

کہ میرے ذرا سے دباؤ سے دوسرا مسافر سیٹ پر سے گرتے گرتے بچا،

چنانچہ اس نے برا سامنہ بنا کر کہا ”بھائی جی آرام نال بیٹھو۔“^(۱۱)

اسی طرح اسی سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے آگے چل کر لکھتے ہیں:

”اب میرے لیے نیند تو کجا، سکون سے بیٹھنے کے تمام راستے بھی مسدود ہو چکے تھے، چنانچہ میں نے سگریٹ نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو برابر والے مسافر نے ایک بار پھر براسا منہ بنایا اور کہا ”بھاجی، اپنی جیب وچ ہتھ پاؤ“۔ (۱۲)

ان اقتباسات کو فنی تناظر میں دیکھا جائے تو ان میں بعض پنجابی الفاظ کسی مخصوص علاقے یا مخصوص قوم کی لفظیات کا منظر پیش کرتی ہیں۔ مثلاً ان دونوں مثالوں میں ”بھاجی“ ایسا پنجابی لفظ ہے جو پورے پنجاب میں رائج نہیں ہے۔ یہ لفظ ایک مخصوص قوم بولتی ہے۔ اس کے مترادف کے طور پر پنجابی میں ہی لفظ ”بھائی جی“، ”بھائی جان“، ”بھراوا“ بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ یوں ظاہر ہوتا ہے کہ پنجابی زبان کے الفاظ استعمال کرتے وقت مختلف قوموں کے مزاج اور ان کی لسانیاتی صورت حال کو بھی سامنے رکھتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ وہ زبان کے مختلف لہجوں کے بارے میں خاصی معلومات رکھتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے پنجابی زبان کی لفظیات استعمال کرتے وقت اس ماحول اور خاص طور پر دیہاتی ماحول کو خاص طور پر مد نظر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بہت سے مضامین کے عنوانات بھی پنجابی دیہاتی ماحول کے مختلف جانوروں اور اس ماحول کی دیگر اشیاء کے ناموں پر ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں پنجابی لفظیات کے استعمال کو فنی تناظر میں دیکھا جائے تو ان کے یہاں پنجابی زبان کی تراکیب کے ساتھ ساتھ بعض ایسے مختصر پنجابی الفاظ بھی ملتے ہیں کہ اگر ان کی جگہ کوئی اردو لفظ لگایا جاتا تو شاید وہ لفظ اتنے اختصار کا حامل نہ ہوتا اور دوسری بات یہ کہ پنجابی لفظ جملے کو جو معنی اور خوب صورتی عطا کر رہا ہے اس کا اردو متبادل ایسی خوب صورتی اور روانی جملے میں پیدا نہ کر سکتا۔ اس ضمن میں ایک مثال دیکھیے:

”ان کا کہنا ہے کہ غیر شادی شدہ شخص کو یہ سہولت ہوتی ہے کہ وہ چارپائی کے دونوں طرف اتر سکتا ہے چنانچہ اس سہولت کے لیے انہوں نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ اب جو وہ شادی پر رضامند ہوئے ہیں تو صرف اس بناء پر کہ کہیں پڑھ بیٹھے کہ شادی شدہ مردوں کی عمر لمبی ہوتی ہے حالانکہ ہوتی نہیں انہیں عمر لمبی لگتی ہے بہر حال میرے یہ دوست اب تل گئے ہیں کہ وہ شادی بھی کریں گے اور اپنے رن مرید ہونے کا مکمل کھل کر اعلان بھی کریں گے۔“ (۱۳)

اس اقتباس میں قاسمی صاحب نے ایک اہم سماجی رویے کی جانب بڑے لطیف انداز میں اشارہ کیا ہے۔ شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریوں کی وجہ سے ہر کسی کو اپنی زندگی پہلے

سے زیادہ مصروف نظر آتی ہے۔ قاسمی صاحب اس کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اپنے دوست کا ذکر کرتے ہوئے پنجابی لفظ ”تل“ کا استعمال کر کے جملے میں انتہائی خوب صورتی اور گہری تاثیر پیدا کر رہے ہیں۔ ”تل“ کا اردو متبادل ”مصمم ارادہ کر لینا“، ”کسی کام کے لیے ڈٹ جانا“ اور اس طرح کے دیگر الفاظ ہیں۔ اب اگر تل کی جگہ یہ اردو الفاظ استعمال ہوتے تو شاید اتنے اختصار کے ساتھ اتنا بڑا مفہوم بیان نہ ہو سکتا اور جملے کو فنی حسن متاثر ہوتا لیکن قاسمی صاحب نے ”تل“ کا لفظ استعمال کر کے جملے کا ابلاغ بھی مؤثر بنا دیا ہے اور اس میں خوب صورتی بھی پیدا کر دی ہے۔ اسی طرح ایک اور جگہ وہ اسی طرح کا ایک ہی پنجابی کا لفظ استعمال کر کے جملے کی تاثیر میں خاصا اضافہ کر دیتے ہیں:

”میں سوچتا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو لاکھوں دلوں کی دھڑکن بنا دیتا ہے اور اسے باعزت اور خوشحال زندگی گزارنے کے مواقع بھی فراہم کر دیتا ہے تو پھر اسے ”کھے“ کھانے کی کیا ضرورت پڑتی ہے۔“

(۱۳)

”کھے کھانا“ پنجابی لفظ ہے جس کے معنی سب کچھ ہوتے ہوئے فضول کی بے عزتی مول لینا ہے۔ یہاں قاسمی صاحب نے یہ پنجابی لفظ ایسے اشخاص کے لیے استعمال کیا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہر نعمت سے نوازا ہوتا ہے اس کے باوجود وہ حرص زر میں اپنے ضمیر اور ملی حمیت کا سودا کرتے ہیں۔

یوں مجموعی طور پر دیکھا جائے تو قاسمی کی تحریروں میں پنجابی لفظیات کا استعمال بڑا بر محل اور موزونیت کے ساتھ ہوا ہے۔ ان کی تحریروں میں پنجابی لفظیات اپنے سماجی اور ثقافتی منظر نامے کی عکاس بننے کے ساتھ ساتھ فنی حوالے سے بھی مؤثر ہیں۔ ان کے ہاں پنجابی لفظیات کا استعمال ان کی تحریر کے ابلاغ کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ معنوی سطح پر بھی ان کی تحریر کو جاندار بناتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں جہاں اور بہت سی چیزیں ان کی تحریر کے حسن کو بڑھاتی ہیں وہاں ایک اہم چیز محاورات کا استعمال بھی ہے۔ عطاء الحق قاسمی کے ہاں محاوروں کا استعمال متنوع طریقے سے ملتا ہے۔ کہیں تو وہ محاورے کے مفہوم کو مد نظر رکھتے ہوئے اصل محاورے میں لفظی تبدیلیاں کرتے ہوئے اسے اپنے الفاظ میں تحریر کا حصہ بنا دیتے ہیں جس سے قاری کی نظر محاورے اور ان کی تحریر کے باہمی تعلق پر پہنچ کر اصل مفہوم اخذ کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ یہ ایک انتہائی مشکل کام ہے کہ محاورے کو عبارت کا حصہ اس انداز میں بنا دیا جائے کہ قاری مصنف کی اپنی تحریر اور محاورہ دونوں کا بیک وقت لطف لینے لگتا ہے۔ اور

حظ سے سرشار ہو جاتا ہے۔ ایسی تحریر قاری کو اپنے سحر میں جکڑ کر اس پر لفظوں کی کثیر معنویت آشکار کر دیتی ہے۔ اس ضمن میں عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں، ایک مثال ملاحظہ ہو:

”جو والدین یا میرج بیورو والے شادی کے اشتہارات اخبار میں چھپواتے ہیں، ان کی رسائی ڈاک کے ایک لفافے یا رجسٹریشن فیس کی ادائیگی سے ممکن ہو جاتی ہے اور پینگ پھٹکری لگے بغیر رنگ بھی چوکھا آتا ہے۔“ (۱۵)

اس بیان کو دیکھا جائے تو پینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ چڑھا چوکھا ایک مشہور محاورہ ہے، قاسمی صاحب نے یہاں اس محاورے کو اپنے الفاظ میں اس طرح استعمال کیا ہے کہ اس کا فنی حسن نکھر گیا ہے اور تحریر میں بھی ایک نئی جاذبیت پیدا ہو گئی ہے۔ قاری اس محاورے کو اس کی اصلی صورت میں بیان کرنے کا سادگی لینے لگتا ہے۔ یوں قاسمی کی تحریر میں لفظی تبدیلیوں کے ساتھ محاورات کا استعمال نہ صرف ان کی تحریر کو قابل رشک بناتا ہے بلکہ ان کے استعمال کردہ محاوروں کے اصل حسن کو بھی برقرار رکھتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں استعمال ہونے والے محاورات پنجابی حسن کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ویسے بھی پنجابی لفظیات کا استعمال کثرت سے ملتا ہے، محاورے اکثر وہ ایسے استعمال کرتے ہیں جن سے پنجابیت جھلکتی نظر آتی ہے۔

محاورے کو عبارت کا حصہ بنانا اور اس طرح استعمال کرنا کہ اس سے عبارت کی روانی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو، عطاء الحق قاسمی کا عظیم فن ہے جس کا ثبوت ان کی تحریروں میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ اس ضمن میں اور مثال ملاحظہ ہو:

”یہ کہتے ہوئے استاد مکرم انصاف مرحوم نے شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا ”دیکھو بیٹے، بیک وقت بادشاہ ہونا اور اس کے ساتھ ساتھ عادل مشہور ہونا کوئی آسان کام نہیں، اس کے لیے بہت پاؤں بیلنے پڑتے ہیں۔“ (۱۶)

پاؤں بیلنا ایک مشہور محاورہ ہے جس کے معنی سخت محنت کرنا، خوب تگ و دو کرنا اور ایک کام کو انجام دینے کے لیے متنوع طریقے اختیار کرنا کے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے اس محاورے کو بڑی خوب صورتی سے اپنی تحریر کا حصہ بنایا ہے۔ جس سے ان کی تحریر کی رعنائی اور بڑھ گئی ہے۔

بعض اوقات وہ محاورات کا استعمال اس طرح کرتے ہیں کہ ایک ہی جملے میں ایک سے زیادہ محاورے اتنی خوبصورتی سے سمو دیتے ہیں کہ قاری کو اصلیت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ایسا وہ اس وقت کرتے ہیں جب کسی ایسے کردار کے منہ سے محاورے ادا کرتے ہیں جو زیادہ پڑھا لکھا نہ ہو لیکن خود کو دوسروں کے سامنے بہت زیادہ تعلیم یافتہ اور اہل زبان کی صف میں شامل کرنے کے جتن کرتا ہو۔ مثلاً اپنے ایک مضمون ”قنوطی“ میں وہ ایک کردار کے منہ سے اس طرح کے الفاظ ادا کرواتے ہیں۔

”اوہو، یہ تو سونے پر سہاگہ ہوا، میرا مطلب ہے ایک کریلا اور دو جانیم چڑھا۔ معافی چاہتا ہوں کوئی مناسب محاورہ نہیں سوچ رہا، کہنا یہ چاہتا ہوں کہ بہت افسوس ہوا۔“ (۱۷)

ان جملوں میں استعمال ہونے والے محاورے اور صورت حال کو دیکھا جائے تو دونوں میں کوئی مشترک چیز نہیں ملتی کیونکہ جو صورت حال بیان ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ ایک کردار نوکری نہ ملنے اور پانی نہ آنے کا رونا رو رہا ہے جس کو بیان کرنے کے لیے محاورے استعمال کیے جا رہے ہیں کسی کام کے بہترین ہونے کے یعنی سونے پہ سہاگہ اور ساتھ ہی دوسرا محاورہ ایک کریلا دوسرا نیم چڑھا استعمال ہو رہا ہے۔ اور انداز ایسا اپنایا جا رہا جیسے کسی شخص کو زبان پہ قدرت تو نہ ہو لیکن وہ اپنے آپ کو قادر الکلام ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عطاء الحق قاسمی محاورات کے استعمال میں بھی خاص مہارت اور ملکہ رکھتے ہیں اور محاورہ استعمال کرتے وقت صرف زبان دانی کا ثبوت ہی نہیں دیتے بلکہ سماج کے مختلف کرداروں کی سماجی حیثیت کو بھی سامنے رکھتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی بعض اوقات اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے بھی محاورے تباہ کر جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک جگہ یوں لکھتے ہیں:

”عمر چھپانے کی شوقین خواتین میں سے ایک خاتون مجھے ایسی بھی ملیں جو اس رویے کی شد و مد کے ساتھ مخالف تھیں، ان کا کہنا تھا کہ عمر چھپانے کے ساتھ اصلیت نہیں چھپائی جاسکتی چنانچہ جو خواتین اپنی عمر کم بتاتی ہیں، وہ صرف دوسروں کو نہیں خود کبھی دھوکے دیتی ہیں، یہ خاتون کہہ رہی تھیں کہ انھیں اپنے ۴۳ برس کے ہو جانے کا کوئی افسوس نہیں یہ ان کی زندگی کا بہترین پیریڈ ہے جو وہ گزار رہی ہیں، ان کی یہ باتیں سن کر میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ میں ان کی عمر کے حوالے سے اپنا تخمینہ بتا کر اس ۴۳ سالہ رنگ میں بھنگ ڈالوں!“ (۱۸)

رنگ میں بھنگ ڈالنا بھی ایک محاورہ ہے جس کا مطلب بنے بنائے کام کو بگاڑنا ہوتا ہے یہاں کسی جہی ہوئی محفل کو خراب کر دینا بھی اس کے معنوں میں آتا ہے۔ محاورہ لوگوں کی بول چال اور تجربات سے جنم لیتا ہے اور اس میں سماج کی کسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہوتا ہے۔ اس تناظر کو عطاء الحق قاسمی خوب مد نظر رکھتے ہیں۔ وہ سماجی تناظر کو سامنے رکھتے ہوئے محاورے استعمال کرتے ہیں اور پنجابی محاورے ان کی تحریر کو معنوی اور جمالیاتی سطح پر بہترین بناتے ہیں۔ ایک جگہ پنجابی محاورے کا استعمال یوں کرتے ہیں۔

”میں نثری نظم کے خلاف نہیں ہوں، مگر کچھ غیر شاعر نے شاعر کہلوانے کے لیے یہ چور دروازہ تلاش کیا ہے، خصوصاً کچے پکے ذہنوں والے نوجوان نثری نظم کے امام مبارک علی کے پیچھے نیت باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ڈھٹی ہوئی مسیت داگا لڑامام“ (۱۹)

عطاء الحق قاسمی محاورات کے استعمال میں طبقاتی تفریق کو بھی سامنے رکھتے ہیں۔ محاورہ کسی عبارت میں اپنا حسن اسی وقت دکھاتا ہے جب اس کے تمام لوازمات پورے کرتے ہوئے اسے استعمال کیا جائے۔ سماجی، ثقافتی اور طبقاتی منظر نامے کو سامنے رکھتے ہوئے محاورے کا استعمال نہ صرف اس تحریر کو فنی حوالے سے خوب صورت بناتا ہے بلکہ موضوعاتی اور فکری سطح پر بھی تحریر کو کثیر معنویت کے وصف سے مالا مال کرتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں استعمال ہونے والے محاورات بر محل اور تحریر کے اسلوب کو زیادہ بامعنی بناتے ہیں۔ حکمرانوں کے بارے میں عام طور پر یہ مشہور ہے کہ ان کے ہاں طاقت کا تصور خاصا مضبوط ہوتا ہے۔ بہت سے حکمران اپنے خلاف یا قانون کے خلاف ہونے والی سرگرمیوں کو طاقت کے ذریعے کچلنے پر یقین رکھتے ہیں۔ مارشل لا کے دنوں میں تو یہ تصور اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔ طاقت کا تصور نہ صرف حکمرانی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ حکمران بننے کے لیے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اس صورت حال کو قاسمی صاحب نے کس خوبصورتی سے پنجابی محاورے سے بیان کیا ہے:

”اقتدار میں آنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے جو تیسری دنیا کے ممالک میں نہ صرف آزما گیا ہے بلکہ بیشتر صورتوں میں بہت مفید ثابت ہوا ہے، چنانچہ حکمران ہمیشہ ”ڈنڈا پیراے وگڑیاں تگڑیاں دا“ والے سنہری اصولوں پر عمل کرتے ہیں۔“ (۲۰)

عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں پنجابی زبان کے محاورات اور ضرب الامثال کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے جو مختلف اسفار کیے تھے ان میں ان کے ساتھ بہت سے ملکی اور خاص طور پر پنجابی لوگ شامل تھے۔ اور ان کی آپس میں گفتگو کے دوران میں پنجابی الفاظ کا استعمال موقع محل کی مناسبت سے ہونا لازمی امر ہے۔ ذیل میں اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

”دوسری جنگ عظیم کے دوران بد بخت انگریز فوجیوں نے مقامی آبادی کی نسل تبدیل کرنے کی جو کوششیں کی تھیں وہ کم از کم اس کیس میں پوری طرح کامیاب ثابت ہوئی تھیں۔“ لوجی ہن ٹیم چلیا گیا ہے! گویا اب شاہ جی بھی قائل ہو گئے تھے۔“ (۲۱)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو عطاء الحق قاسمی کے اردو نثر میں محاورات اور خاص طور پر پنجابی محاورات کا استعمال خاصا موزوں اور بر محل ملتا ہے، جس سے نثر میں فنی سطح پر حسن پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ معنوی سطح پر بھی تحریر کو اعلیٰ مقام پر پہنچانے میں انہوں نے خوب کام لیا ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریریں نثر لطیف کے عمدہ نمونے ہیں۔ نثر لطیف میں تلمیح کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ قاسمی نہ صرف اس اہمیت سے آگاہ ہیں بلکہ وہ اپنی نثر میں مختلف تلمیحات استعمال کرتے وقت ان کے لوازمات کو بھی مد نظر رکھتے ہیں جس سے ان کی استعمال کردہ تلمیحات ان کی نثر کا حسن بڑھانے کے ساتھ ساتھ فکری بالیدگی بھی عطا کرتی ہیں۔ ذیل میں اس ضمن میں ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ ملک میں جاری سفارش کے کلچر کو مختلف تخلیق کاروں نے مختلف انداز میں بیان کیا ہے، اکثریت کے ہاں اس کے منفی پہلو کی ہی عکاسی ملتی ہے کہ سفارش کے ذریعے لوگ دوسروں کا حق مار جاتے ہیں۔ لیکن عطاء الحق قاسمی سفارش کے اس عمل کو ایک اور زاویے سے دیکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ہمیں جب کسی سے کام پڑتا ہے اور وہ کام اکثر جائز ہوتا ہے جو ناجائز نظام کی وجہ سے اپنے آپ نہیں ہو رہا ہوتا، تو ہم کوئی سفارش ڈھونڈتے ہیں اور سر اپا عجز و انکسار بن کر اس سفارشی کے پاس پہنچتے ہیں۔ سفارشی بھی اسی ناجائز نظام کا باسی ہوتا ہے چنانچہ وہ اپنی سفارش اپنے پاس سنبھال کر رکھنا چاہتا ہے کہ خود اسے بھی کسی وقت اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے لیکن جو میری طرح کے رقیق القلب سفارشی ہوتے ہیں، وہ فوراً اس آتش نمرود میں کود پڑتے ہیں۔“ (۲۲)

قاسمی نے سفارش کے حوالے سے معاشرے کا ایک نیا زاویہ دکھایا ہے کہ سفارش صرف دوسروں کا حق مارنے کے لیے ہی نہیں کی جاتی بلکہ بعض اوقات اپنا حق لینے کے لیے بھی لوگوں کو سفارش بلکہ رشوت تک کی لعنت کو گلے لگانا پڑتا ہے اس کی بڑی وجہ نظام کی خرابی اور احتساب کا کمزور نظام ہے جس نے اس معاشرے کو گھن کی کھوکھلا کر دیا ہے۔ قاسمی صاحب نے اس صورت حال کو بیان کرنے کے لیے آتش نمرود کی تلمیح استعمال کی ہے۔ کہ سفارشی کلچر کی یہ آگ ایسی ہے کہ لوگ اس میں کودے جا رہے ہیں جب کہ ان کا کوئی قصور بھی نہیں۔ آتش نمرود کی تلمیح کو دیکھا جائے تو ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو جب نمرود نے آگ میں پھینکا تھا تو ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا کوئی قصور نہیں تھا بلکہ نمرودی نظام خراب تھا جس کے خلاف ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اللہ کے حکم سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ آج بھی سفارش کی جو آگ معاشرے میں جل رہی ہے اس میں کودنے والے بہت سے ایسے ہوتے ہیں جن کا اپنا کوئی قصور نہیں ہو تا بلکہ نظام کی خرابی کی وجہ سے وہ اپنا جائز حق لینے کے لیے سفارش کی آگ میں کود پڑتے ہیں۔ اس زاویے سے عطاء الحق قاسمی نے اس تلمیح کا استعمال بڑا بر محل کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تحریروں میں اور بھی بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں مختلف تلمیحات کا موزوں استعمال کر کے انہوں نے اپنی نثر کی تاثیر میں اضافہ کیا ہے۔

تحریروں کی تاثیر میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ نثر میں کسی ایک چیز کو کسی سماج کی دوسری چیز سے سماجی تناظر میں مطابقت اور مشابہت پیدا کرنے کے لیے بھی تشبیہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک چیز ایک معاشرے کا حصہ ہوتی ہے لیکن اس سے مشابہ کوئی اور چیز کسی دوسرے معاشرے کا حصہ ہوتی ہے۔ اب مشبہ اور مشبہ بہ دونوں کے ذریعے ان معاشروں میں بھی مطابقت قائم کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ یوں تشبیہ کا استعمال اس کے لیے بھی کیا جاتا ہے۔ تشبیہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ دونوں چیزوں میں کوئی نہ کوئی اشتراک لازمی پایا جائے، اشتراک کے بغیر تشبیہ کا استعمال بے معنی ہوتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریروں کو دیکھا جائے تو ان کے ہاں نثر میں تشبیہ کا استعمال بڑے بہترین انداز میں ہوا ہے۔ تشبیہ کے ذریعے وہ نثر میں مختلف چیزوں کو ایک دوسرے سے مشابہ بیان کر کے جملوں میں خوب صورتی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان چیزوں کی تاثیر میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک جگہ تشبیہ کا استعمال کرتے ہوئے صورت حال کو یوں خوب صورت انداز میں بیان کرتے ہیں:

”اگر تو آپ کی سفارش کام نہیں آتی تو ”سائل“ تیر کی طرح واپس آپ کی طرف آتا ہے اور کہتا ہے ”جناب مجھے اپنا کام نہ ہونے کا کوئی افسوس نہیں مگر مجھے یہ دیکھ کر سخت دکھ ہوا کہ جناب کی شہر میں ٹکے کی عزت نہیں۔“ (۲۳)

معاشرے میں ہم دیکھتے ہیں کہ کسی کام کے لیے سفارش ڈھونڈنا ہی بہت بڑا امتحان ہوتا ہے اور اگر کوئی تگ و دو کے بعد یہ مرحلہ طے کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کے بعد بھی اگر اس کا کوئی کام نہیں ہو پاتا تو اسے اپنے وقت کے ضیاع کا شدید احساس ہوتا ہے اور وہ افسران کے ساتھ ساتھ اس شخص کو بھی مورد الزام ٹھہرانے لگتا ہے جس کی سفارش لے کر وہ افسران کے ہاں حاضر ہوا تھا۔ جن کا بس چلتا ہے وہ سفارش کرنے والے کو کھری کھری سنانے کے لیے فوراً اس کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ ان کے اس فوراً واپس پہنچنے کو قاسمی صاحب نے ”تیر کی طرح“ کی تشبیہ سے بیان کیا ہے۔ ”تیر کی طرح“ کی تشبیہ پنجابی میں بھی استعمال کی جاتی ہے جس کے معنی بہت جلد ہونا کے ہیں کہ جس طرح تیر کمان میں سے نکلتے ہی تیزی سے اپنے ہدف کی طرف بڑھتا ہے اسی طرح کسی کام کے لیے جلدی سے بڑھنے کو اس تشبیہ سے بیان کیا جاتا ہے۔

”تیر کی طرح“ کی تشبیہ کی ایک اور خاص خوبی یہ ہے کہ تیر اپنی کمان سے نکلنے کے بعد ایک تو تیزی سے ہدف کو بڑھتا ہے دوسرا یہ کہ اپنی سمت تبدیل نہیں کرتا بلکہ سیدھا چلا جاتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھیں تو قاسمی صاحب کے ہاں اس جملے میں اس تشبیہ کے استعمال کی افادیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ جس طرح تیر کمان سے نکلنے کے بعد اپنی سمت تبدیل کیے بغیر جلدی سے ہدف کو بڑھتا ہے ایسے ہی ”سائل“ اپنا کام نہ ہونے کے بعد دفتر سے نکلتے ہی کہیں اور جانے کے بجائے سیدھا اور تیزی سے سفارشی کے گھر پہنچتا ہے اور اسے کھری کھری سنا دیتا ہے۔

پنجابی تشبیہات کا استعمال عطاء الحق قاسمی کے ڈراموں میں بھی ملتا ہے۔ ایک ڈرامے ”خواجہ اینڈ سنز“ میں کردار بولتے ہوئے پنجابی تشبیہات یوں استعمال کرتے ہیں:

”میری مان تو شادی کر لے، گواچی گاں کی طرح پھر تار ہتا ہے۔“ (۲۴)

یوں یہ کہا جس سکتا ہے کہ قاسمی صاحب کی نثر میں تشبیہات کا استعمال بھی خاصا موزوں اور معنوی سطح پر خاصے بہترین انداز میں ہوا ہے جس سے ان کی نثر صوری اور معنوی دونوں حوالوں سے اعلیٰ مقام کی حامل قرار پاتی ہے۔

تخلیق کار ادب تخلیق کرتے وقت جن صنائع سے کام لیتا ہے ان میں سے ایک اہم صنعت تکرار لفظی کی بھی ہے۔ اس میں ایک لفظ کو ایک سے زیادہ بار اکٹھا استعمال کیا جاتا ہے جس سے تحریر کی تاثیر میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خاص آہنگ بھی جنم لیتا ہے جو قاری کے لیے تحریر میں دلچسپی برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کی نثر میں اس صنعت کا استعمال بھی خاصا ملتا ہے۔ وہ نثر میں مختلف الفاظ کے بار بار استعمال سے تکرار لفظی کی ایسی خوبی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جس سے قاری ان کی تحریر کے آہنگ میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ تکرار لفظی کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

”ان دنوں ہمارے ایک دوست تازہ تازہ اسیر محبت ہوئے ہیں، گزشتہ روز صبح صبح ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے ”میں شدید طور پر محبت میں مبتلا ہو گیا ہوں، مجھے نصیحت کرو“ (۲۵)

ان جملوں میں ”تازہ تازہ“ اور ”صبح صبح“ کی تکرار لفظی نے صورت حال کی شدت کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ جملے کی تاثیر میں بھی اضافہ کر دیا ہے۔

اسی طرح اپنے سفر ناموں میں انہوں نے بعض اوقات پنجابی زبان کے اشعار کا استعمال کر کے بھی اپنی نثر کو خوبصورتی اور رعنائی بخشی ہے۔ ایک سفر نامے میں پنجابی زبان کے معروف شاعر عبیر ابوذری کے شعر کو یوں استعمال کرتے ہیں۔

”مجھے کبھی سرمایہ دار بن کر دیکھنا چاہیے تاکہ پتا تو چلے کہ اس کے بعد انسان کی“ جون ”میں تبدیلیاں کیسے آتی ہیں؟ اس خواہش کا اظہار عبیر ابوذری نے بھی اپنے اس شعر میں کیا ہے۔

سہگل ہون نوں جی کردا اے ساڈاوی

کٹے چون نوں جی کردا اے ساڈاوی (۲۶)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو عطاء الحق قاسمی کی نثر میں پنجابی لفظیات ان کے اسلوب کو جاندار بناتی ہیں۔ ان کی نثر میں پنجابی لفظیات فکری سطح پر پنجابی معاشرت، پنجابی ثقافت اور پنجابی فنون لطیفہ کی عکاسی کرتی ہیں توفنی سطح پر پنجابی لفظیات کا استعمال پنجاب کے لسانی منظر نامے کو واضح کرنے میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ انھوں تحریر کا جو اسلوب ایجاد کیا ہے وہ انھیں معاصر تخلیق کاروں میں نمایاں مقام دلانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

حوالہ جات

- ۱۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۱۵۹
- ۲۔ ایضاً، ص ۱۵۹
- ۳۔ ایضاً، ص ۱۶۰
- ۴۔ ایضاً، ص ۱۶۹
- ۵۔ ایضاً، ص ۱۶۹
- ۶۔ ایضاً، ص ۲۲۲
- ۷۔ ایضاً، ص ۲۶۳
- ۸۔ ایضاً، ص ۱۶۲
- ۹۔ ایضاً، ص ۲۹۸
- ۱۰۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۷۲
- ۱۱۔ عطاء الحق قاسمی، عطایے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۵۱۹
- ۱۲۔ ایضاً، ص ۵۱۹
- ۱۳۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۱۲۷
- ۱۴۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسنا رونا منع ہے، ص ۱۵۰
- ۱۵۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۱۶۳
- ۱۶۔ ایضاً، ص ۲۳۵
- ۱۷۔ عطاء الحق قاسمی، شر۔ گوشیاں، نستعلیق، مطبوعات، لاہور، اشاعت ہشتم، ۲۰۱۲ء، ص ۱۵۸
- ۱۸۔ ایضاً، ص ۲۸۰
- ۱۹۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۳۹۵

- ۲۰۔ عطاء الحق قاسمی، شر۔ گوشتیاں، نستعلیق، مطبوعات، لاہور، اشاعت ہشتم، ۲۰۱۲ء، ص ۱۹۱
- ۲۱۔ ایضاً
- ۲۲۔ عطاء الحق قاسمی، عطایے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۳۶۷
- ۲۳۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۲۸۷
- ۲۴۔ عطاء الحق قاسمی، خواجہ اینڈ سنز (ڈراما)، سی ڈی
- ۲۵۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۲۸۷
- ۲۶۔ ایضاً، ص 287